سُورَةُ الفَاتِحَة

قرآن کریم کی پہلی سورت کے کئی نام یا "لقب" کتابوں میں مذکور ہیں مصاحف میں اس کا عنوان برصغیر اور بیشتر عرب اور افریقی ممالک میں اسی طرح لکھا جاتا ہے یعنی "سُوْرَةُ الفَاتِحَةِ"۔ البتہ بعض ممالک (مثلاً ترکی، ایران، نائیجیریا اور بعض دفعہ شام) کے مصاحف میں اس کا عنوان " سُوْرَةُ فَاتِحَةِ الکتابِ" لکھا جاتا ہے ۔ اور اس میں " الکتاب" سے مراد اللہ کی کتاب یعنی قرآن کریم ہی ہوتا ہے ۔

یہ سورۃ اکثر اہلِ علم کے نزدیک، بلحاظِ نزول، مکّی سورت ہے ۔اور اس کی آیات کی کل تعداد بلا اختلاف سات ہے ۔تاہم اس بات میں اختلاف ہے کہ کہاں کہاں آیت ختم ہوتی ہے ۔مکّی اور کوفی " طریقۂ شمار" کے مطابق " بسم اللہِ الرّحمٰن الرحیم " اس سورۃ کی پہلی مکمل آیت ہے — باقی پانچ طریقہ ہائے شمار — یعنی مدنی اوّل وثانی، بصری، دمشقی اور حمصی — کے مطابق " بِسمِ اللہِ الرّحمٰن الرّحیم اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ العٰلَمِیْن" پر اس سورت کی آیت ۱ ختم ہوتی ہے یعنی " بسم اللہ" آیت کا جزء ہے۔ ان پانچ طرقِ شمارِ آیات کے مطابق " اَنْعَمْتَ عَلَیْہِمْ " پر آیت ۶ ختم ہوتی ہے جب کہ پہلے دو — مکی اور کوفی — طریقۂ شمار کے مطابق وہاں — اَنْعَمْتَ عَلَیْہِم پر — اختتام آیت نہیں ہے — اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں — برصغیر میں سورۃ کے اس پہلے " عَلَیْہِم " کے بعد غیر کوفی آیت کا نشان " ۵ " ڈالا جاتا ہے ("پہلا" اس لئے لکھا ہے کہ سورۃ میں " عَلَیْہِم " دو دفعہ آیا ہے ۔)

لفظ " سُوْرَۃ " کی لغوی اصل کے بارے میں دو قول ہیں :۔

۱ ۔ پہلا قول : اس کا مادہ " س و ر " اور وزن " فُعْلَۃٌ " ہے ۔ فعل ثلاثی مجرد سَارَ یَسُوْرُ سَوْرًا (باب نصر سے) کے معنی ہیں۔ بلند ہونا ، دیوار پر چڑھنا اور اس مادہ سے ہی باب " تفعّل " کا ایک صیغہ فعل قرآن کریم (ص : ۲۱) میں وارد ہوا ہے ـــ اور اس سے ہی " سُوْرٌ " بمعنی شہر کی فصیل (بیرونی دیوار) آتا ہے اور یہ لفظ بھی قرآن کریم (الحدید : ۱۳) میں آیا ہے ـــ اس لفظ (سُوْرٌ) کے ایک معنی درجہ اور منزلت بھی ہیں۔ اور عربی زبان میں کامل اور مکمل اونٹنی کو بھی " سُوْرَۃٌ " کہتے ہیں ۔

۲ ۔ دوسرا قول : اس کا مادہ " س ء ر " اور وزن " فُعْلَۃ " ہے ۔ اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد سَأَرَ یَسْأَرُ سُؤْرًا (باب فتح سے) اور سَئِرَ یَسْأَرُ سُؤْرًا (باب سمع سے) ہر دو کے معنی ہیں باقی بچنا ، کچھ حصّہ باقی رہ جانا ۔ اور "سُؤْرَۃٌ" کے معنی ہیں "بقایا حصّہ" یا (صرف) "حصّہ" ـــ اور ھمزۂ ساکنہ ماقبل متحرک کو اس کی حرکت کے موافق حرف (ا ، و ، ی) کی صورت میں پڑھنا جائز ہے یعنی عرب اس طرح بھی بولتے ہیں۔ اس بناء پر " سُؤْرَۃ " کو " سُوْرَۃٌ " بولنا بھی جائز ہے۔ ویسے یہ مادہ اور اس سے کوئی فعل قرآن کریم میں استعمال نہیں ہوا ہے۔

ـــ اس طرح لفظ " سُوْرَۃ " میں ـــ رتبہ ، درجہ ، منزلت ، ایک مکمل وحدت (UNIT) اور حصّہ کے معنی شامل ہیں۔

لفظ " الفاتحۃ " کا مادہ " ف ت ح " اور وزن " فَاعِلَۃٌ " ہے ۔ اور یہ فعل ثلاثی مجرد فَتَحَ یَفْتَحُ فَتْحًا بمعنی "کھولنا" سے اسم فاعل مؤنث کا معرف باللّام صیغہ ہے جس کے معنی ہیں "کھولنے والی"۔ یہ اس سورۃ کا معروف اور زیادہ مستعمل نام ہے۔ قرآن کریم کو شروع سے کھولیں تو سب سے پہلے یہی سورت سامنے آتی ہے۔

اب ہم اللہ عزوجل کے بابرکت نام کے ساتھ اس سورۃ کا مطالعہ ـــ بلحاظ لغات و

اعراب اور رسم وضبط ـــــ شروع کرتے ہیں۔

۱:۱ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

یہ بیان ہو چکا ہے کہ " بسم اللہ " (جسے قرّاء کی اصطلاح میں " بَسْمَلَة " کہتے ہیں) مکّی اور کوفی طریقۂ شمارِ آیات کے مطابق سورۃ الفاتحہ کی پہلی آیت ہے ـــ اس لئے اس کے اختتام پر آیت کا نمبر شمار ① دیا گیا ہے۔

۱:۱:۱ اللغة

[بِسْمِ] = بِ + اسْم ـــ " باء " (بِ) کے معنی اور مختلف استعمالات پر استعاذہ کی بحث میں بات ہو چکی ہے ـــ یہاں یہ (بِ) " کے ساتھ " ، " کی مدد سے " یا صرف " سے " کے معنی میں آیا ہے۔

لفظ " اِسْمٌ " (جو اردو کے لفظ " نام " کا ہم معنی ہے) کی لغوی اصل کے بارے میں دو قول ہیں :-

۱۔ اکثر اہلِ لغت کے نزدیک اس کا مادہ " س م و " (ناقص واوی) ہے اور اس کا وزن اصلی " فِعْلٌ " یا " فُعْلٌ " ہے۔ یعنی اس کی شکل اصلی " سِمْوٌ " یا " سُمْوٌ " ہے ـــ اہلِ عرب اس کے آخری واو (لام کلمہ) کو گرا کر باقی لفظ کو کئی طرح بولتے ہیں۔ مثلاً سِمٌ ، سُمٌ ، سُمًی ، اُسْمٌ اور اِسْمٌ ـــ ان میں سے زیادہ عام اور مستعمل صورت " اِسْم " ہی ہے ـــ اس طرح اب اس کا وزنِ استعمالی " اِفْعٌ " رہ گیا ہے۔ اس مادہ (سمو) سے فعل ثلاثی مجرد سَمَا یَسْمُوْ سُمُوًّا (باب نصر سے) آتا ہے اور اس کے معنی ہیں ـــ " بلند ہونا " ،

"رتبہ پانا" ـــــ اس طرح اس لفظ (اسم) کو اپنے معنوں سے یہ مناسبت ہے کہ اپنے اسم (نام) کی وجہ سے مُسَمّٰی (نام والا) دوسری چیزوں سے نمایاں اور ممتاز ہو جاتا ہے۔

۲۔ بعض ماہرینِ لغت کے نزدیک لفظ "اِسْم" کا مادہ "و س م" (مثال واوی) اور وزن اصلی "فِعْلٌ" یا "فُعْلٌ" ہی ہے۔ یعنی شکلِ اصلی "وِسْمٌ" (دونوں طرح) ہے۔ مگر یہاں اہلِ عرب ابتدائی "و" (فاءِ کلمہ) کو گرا کر اس کی جگہ ہمزہ (الف) لگا کر "اِسْمٌ" بولتے ہیں۔ یعنی اس صورت میں اب اس کا وزن "اِعْلٌ" رہ گیا ہے۔ اس مادّے سے فعل ثلاثی مجرد وَسَم یَسِم وَسْمًا (باب ضرب سے) آتا ہے اور اس کے معنی ہیں "..... پر ٹھپّہ لگانا" "..... کو نشان زدہ کرنا"، یعنی یہ فعل متعدی ہے۔ اور اس کے ساتھ مفعول بنفسہٖ (بغیر صلہ کے) آتا ہے۔ یعنی "وَسَمَہٗ" کہیں گے۔ اس لحاظ سے لفظ "اسْم" کے معنوں کو اپنے مسمّٰی سے یہ مناسبت ہے کہ وہ اس کے لئے نشان یا علامتِ امتیاز ہے۔

گویا دونوں صورتوں میں مشترک شے "امتیاز" ہے۔ پہلے مادّہ میں "ممتاز ہونا" کا مفہوم ہے اور دوسرے میں "ممتاز کرنا" کا ـــــ اور لفظ "اسم" (نام) میں دونوں معنی شامل ہیں۔

تاہم اہلِ علم کی اکثریت پہلے قول ("سمو" والے) کو ترجیح دیتی ہے۔ اور اس کی ایک وجہ ان کے نزدیک یہ ہے کہ "اسم" کی جمع "اَسماء" آتی ہے جس کا وزن "اَفْعَال" (اور شکلِ اصلی "اَسْماوٌ") ہے۔ اگر اس کا مادّہ "وسم" ہوتا تو اس کی جمع "اَوْسَام" آتی۔

دونوں صورتوں میں "اسم" کے شروع کا ہمزہ (بصورت الف) اصلی (یعنی مادّہ کا) نہیں ہے۔ بلکہ صرف ہمزۃ الوصل ہے جو حرفِ ساکن ("س") سے پہلے ضرورتاً (برائے تلفظ) لگایا گیا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ کسی ماقبل (اپنے سے پہلے) حرف کے ساتھ وصل (ملنے) کی صورت میں یہ تلفظ سے ساقط (SILENT) ہو جاتا ہے۔

[اللّٰہ] ۔ عربی زبان میں یہ لفظ (جسے احتراماً " اسم جلالت " کہتے ہیں) پوری کائنات کے خالق و مالک کے نام کے طور پر قبل از اسلام دور میں بھی (بلکہ زمانہ ہائے دراز سے) استعمال ہوتا تھا۔ پھر قرآن اور حدیث میں بھی یہی نام استعمال ہوا ہے ـــــ اس لئے اس کا ترجمہ کرنے کی ضرورت نہیں ـــــ بلکہ جائز بھی نہیں ـــــ کسی اور زبان کا ـــــ ان ہی معنوں کے لئے مستعمل ـــــ کوئی لفظ بھی اس کا صحیح بدل نہیں ہوسکتا۔ مثلاً فارسی کا " خدا "، ہندی کا " پرماتما " یا انگریزی کا " GOD " وغیرہ۔ مسلمانوں کو ہمیشہ اسم جلالت (" اللّٰہ ") ہی کے استعمال کو ترجیح دینی چاہیئے ۔ یہ اسلامی ثقافت کا نشان ہے ۔

فارسی یا پہلوی زبان کا لفظ " خدا " اب بہت سے مشرقی اسلامی ملکوں میں " اللّٰہ " کے ہم معنی بلکہ مترادف کے طور پر استعمال ہوتا ہے ۔ عام زبان میں اس کا استعمال درست بھی سمجھا جائے تب بھی دینی تحریروں میں ـــــ اور خصوصاً قرآن و حدیث سے ترجمہ کرتے وقت اصل لفظ " اللّٰہ " کا استعمال ہی مناسب ہے ۔ بعض جاہلوں نے " خدا " سے بھی آگے بڑھ کر " اللّٰہ " کے لئے " قانونِ خداوندی " کا لفظ استعمال کر ڈالا ہے ۔ دراصل تو اس کے پیچھے ذاتِ الٰہی (PERSONAL GOD) کے انکار کا عقیدہ کارفرما ہے ۔ تاہم " خدا " کی بجائے " خداوند " کا لفظ استعمال کرنا تو صریح غلطی بلکہ جہالت ہے ۔ اس کے تو معنی ہی " خدا جیسا " کے ہیں ۔ اور اسی لئے مسیحی اسے حضرت عیسٰی (علیہ السلام) کے لئے استعمال کرتے ہیں ۔

لفظ " اللّٰہ " کی لغوی اصل کے بارے میں بیشتر اہلِ علم کی رائے تو یہی ہے کہ یہ دراصل " اَلاِلٰہ " (اَلْ + اِلٰہ) تھا ۔ یعنی " اِلٰہٌ " کو معرّف باللّام کر لیا گیا ۔ پھر کثرتِ استعمال کی بناء پر درمیانی ہمزہ ساقط کر دیا گیا اور دونوں " لام " مدغم ہو گئے اور یوں " تشدید " پیدا ہوئی ۔ اور یہ تشدید ـــــ بلکہ تفخیم (پُر کر کے پڑھنا) کے ساتھ تشدید ـــــ اسم جلالت کی خصوصیت ہے ۔ اور " اَلْ " کو بھی تعظیماً اس اسم کا مستقل حصہ بنا دیا گیا ہے جو کسی صورت میں اس سے الگ نہیں ہوتا ۔ اور اس کا معاملہ دوسرے معرف باللّام اسماء سے مختلف ہے ۔ مثلاً نداء میں اسے بالکل ہمزۂ قطع سمجھا جاتا ہے یعنی " یَا اَللّٰہ " کہیں

گے۔ اس نظریہ کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ عربی جاہلی اشعار میں "اَلْاِ لٰہ" کی ترکیب استعمال ہوئی ہے [1]۔

اس طرح لفظ "اللّٰہ" کے معنی سمجھنے کے لئے لفظ "اِلٰہ" کے مادہ، اشتقاق لغوی اور بنیادی معنی کو جاننا ضروری ہے۔ لفظ "اِلٰہ" کے مادہ اور اس کی لغوی اصل کے بارے میں اہل لغت ونحو کی آراء واقوال کا خلاصہ یہ ہے:-

پہلا قول: اس کا مادہ "ا ل ہ" اور وزن "فِعَالٌ" ہے۔ اس مادّے سے مستعمل کئی افعال اس اشتقاق کی دلیل بنتے ہیں مثلاً ـــــ

(۱) اَلَہَ یَأْلَہَ (فتح سے) کے معنی عبَد یعبُد (نصر سے) یعنی عبادت کرنا ہیں۔ اس طرح "اِلَاہٌ" فِعَالٌ بمعنی مفعول ہے جیسے کتاب بمعنی مکتوب ہے۔ گویا اِلَاہٌ = مَأْلُوْہٌ = مَعْبُوْدٌ ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اردو میں اس کا ترجمہ "معبود" ہی کیا جاتا ہے۔ خیال رہے کہ اس لفظ کا تلفظ یہی (اِلَاہٌ) ہے مگر اس کی املاء (رسم الخط) قرآن کریم میں بھی ـــــ اور عام عربی میں بھی ـــ "اِلٰہ" ہی ہے۔

(۲) اَلِہَ اِلٰی .... (سمع اور فتح سے) کے معنی ہیں...... (کسی میں) سکون پانا یا غم اور مصیبت میں اس کی طرف رُخ کرنا۔ (فزع اِلی.....) کسی کے لئے بے تاب ہونا (وُلِع ب.......)۔

(۳) اَلِہ (سمع سے) کے ایک معنی "حیرت میں ڈوب جانا (تحیّر) بھی ہوتے ہیں

(۴) اَلِہَہٗ (سمع اور فتح سے) کے معنی "...... کو بچانا" اور "...... کی حفاظت کرنا" بھی ہیں۔ یعنی فعل متعدی ہے اور مفعول بنفسہٖ آتا ہے۔

دوسرا قول: اس (اِلٰہٌ) کا مادّہ "و ل ہ" اور وزن وہی "فِعَال" ہے۔ اور شکل اصلی "وِلَاہٌ" تھی جس میں "و" کو "ھمزہ" میں بدل دیا گیا۔ جس طرح "وَحَدٌ" سے "أَحَدٌ" بنا ہے۔

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے زمخشری (کشّاف) ج ۱ ص ۳۵، روح المعانی ج ۱ ص ۵۵۔

بعض افعال اس اشتقاق کی دلیل بنتے ہیں مثلاً ــــ
لَہٗ وَلَہًا (ضرب اور سمع سے) کے ایک معنی جوش وخروش
ہوتے ہیں۔
سے) کے بھی ایک معنی " حیرت میں ڈوب جانا " ہیں (اَلِہ

بھی اَلِہَ اِلی ...... کے مندرجہ بالا تمام معنوں میں مستعمل ہے۔
ہ" اور " ول ھ") کو " اِلٰہ " کی اصل اس دلیل پر قرار دیا
ہے جس کیلئے بندوں کی طرف سے یہ " افعال " سرزد ہوتے
حال" میں سے ــــ اَلِہَ بمعنی عبد (عبادت کرنا) اور
نا) کے سوا کسی اور فعل سے " اِلٰہٌ " مشتق بنتا
ہ کہ اشتقاق کا مطلب یہ ہے کہ " مشتق " میں اصل فعل کے
صورت فاعل یا مفعول یا صفت کے) ضروری ہے۔ مگر ان مذکورہ
چھوڑ کر) اکثر کے معنی مخلوق میں پائے جاتے ہیں نہ کہ خالق میں
لوگوں کی بات میں وزن معلوم ہوتا ہے جنہوں نے ان تمام
ح کی ذہنی عیاشی یا " علمی ہیضہ " قرار دیا ہے[1]۔
نہ اس (لفظ " اِلٰہ ") کا مادہ " ل و ھ " یا " ل ی ہ " ہے
یا لِیاہٌ تھی۔ اس سے فعل لاہ یلوہُ لَوھًا (ن) کے
(ن) " یعنی پیدا کرنا " بھی ہیں اور لاہ یَلِیہُ لَیھًا (ض)
(عَلاَ وَارْتفَعَ) ہیں اور سورج کو اِلٰھَۃٌ (دیوی) کہتے
۔ نیز اسی مادہ (ل ی ھ) کے اسی باب (ضرب) سے

---

[1] روح المعانی ج ۱ ص ۵۵ اور تفسیر طبرسی ج ۱ ص ۱۹ نیز اعراب القرآن

یا معنی "پوشیدہ ہونا" (تستّر و احتجاب) بھی ہوتے ہیں ــــ لفظ "اِلٰہ" کے ساتھ ان معنوں کی نسبت بھی ــــ بلحاظ اشتقاق ــــ قدرے معقول معلوم ہوتی ہے۔

لیکن بہت سے اہل علم ــــ بلکہ اہل دل ــــ کی رائے یہ ہے کہ چاہے لفظ "الٰہ" کا اشتقاق ان تمام مادّوں ــــ یا ان میں سے کسی ایک مادّہ ــــ سے درست بھی ثابت کر دیا جائے جب بھی اسم جلالت (اللّٰہ) سرے سے اسم مشتق ہے ہی نہیں۔ یہ "اَلْاِلٰہ" سے بھی نہیں بنا[1]۔ بلکہ دراصل اسی طرح ذات باری تعالیٰ کے لئے وضع کیا گیا ہے جس طرح دوسری بہت سی چیزوں کے نام ہیں ــــ مثلاً تمام اسماءِ جامدہ جو کسی ذات پر دلالت کرتے ہیں ــــ اور ہر ہر لفظ کا مشتق ہونا لازمی بھی نہیں ہوتا۔ اور یہاں تو لفظ "اِلٰہ" کے لئے بناءِ اشتقاق بنائے گئے بیشتر معنوں کا ذات باری تعالیٰ پر اطلاق بھی محلِ نظر ہے۔

[الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ] ان دو لفظوں کی لغوی اصل اور معنوں کے بارے میں مفسّرین اور ائمۂ لُغت و نحو کے اقوال کا خلاصہ حسب ذیل ہے:۔

۱۔ ان کا مادہ "ر ح م" ہے۔ پہلے لفظ کا وزن "فَعْلَانٌ" (غیر منصرف) ہے اور دوسرے کا وزن "فَعِیْلٌ" ہے۔ یعنی دونوں اسم مشتق ہیں۔ اس مادّہ سے فعل ثلاثی مجرد رحِم یرحَم رحمةً (سمع سے) ہمیشہ متعدی اور بغیر صلہ کے آتا ہے یعنی "رَحِمَہٗ"

---

[1] اس لئے کہ قرآن کریم میں تو کہیں "اَلْاِلٰہ" استعمال نہیں ہوا۔ جاہلی اشعار میں اس کا استعمال ممکن ہے کسی خاص "معبودِ باطل" کے لئے ہی ہوا ہو جو شاعر کا معبودِ ذہنی ہو۔ کیونکہ لفظ "اِلٰہ" کا اطلاق "معبودِ برحق" اور "معبودِ باطل" ہر دو پر ہوتا ہے۔ اس لئے اس کی جمع "آلِہَة" آتی ہے۔ جبکہ اسم جلالت (اللّٰہ) عَلَم ہے۔ اس کا اطلاق سوائے "ذاتِ برحق خالق مالک" کے کسی پر نہیں ہوتا نہ اس لفظ کی جمع آتی ہے۔ گویا "اِلٰہ" کئی ہو سکتے ہیں مگر "اللّٰہ" ایک ہی ہے۔

کہتے ہیں ـــــ " رَحِمَ عَلَیْہِ " کہنا بالکل غلط ہے ـــــ البتہ اردو میں اس کا ترجمہ " ..... پر رحم کرنا یا مہربانی کرنا " کیا جائے گا ۔ یہ " پر " اردو محاورے کی بنا پر آتا ہے ۔ مگر عربی میں مفعول بنفسہٖ یعنی صلہ کے بغیر آتا ہے ۔

۲ ۔ یہ دونوں مبالغہ کے صیغے ہیں مگر " فَعلانُ " میں بمقابلۂ " فَعِیل " زیادہ مبالغہ ہوتا ہے ۔ اس لئے " رحمٰن " کے معنی " بے حد رحمت والا " اور " رحیم " کے معنی " بہت رحمت والا " ہوں گے ۔

۳ ۔ " رحمٰن " تو صیغۂ مبالغہ ہے مگر " رحیم " صفتِ مشبّہ ہے یعنی " رحمٰن " کثرتِ رحمت پر اور " رحیم " دوام رحمت پر دلالت کرتا ہے ۔ اس طرح " رحمٰن " کے معنی " بکثرت رحمت والا " اور " رحیم " کے معنی " ہمیشہ رحمت والا " ہوں گے ۔ اسی چیز کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان اسماء کا اردو ترجمہ یوں کیا جاتا ہے ـــــ

الرحمٰن : بڑا مہربان ۔ نہایت مہربان ۔ بے حد مہربان ۔ نہایت رحم کرنے والا ۔

الرحیم : مہربان ۔ بڑا رحم والا ۔ نہایت رحم والا ۔ بار بار رحم کرنے والا ۔

۴ ۔ " الرحمٰن " اسم صفت کے طور پر بھی صرف " اللہ " کے لئے استعمال ہوتا ہے ، جب کہ " رحیم " غیر اللہ کے لئے بھی استعمال ہو سکتا ہے اور (قرآن کریم میں) ہوا ہے ـــــ " الرحمن " ہمیشہ معرفہ (معرّف باللام) آتا ہے ـــــ (ماسوائے ندا کے یعنی جب منادٰی ہو) مگر " الرحیم " معرفہ نکرہ دونوں طرح آتا ہے ۔

۵ ۔ قرآن کریم میں متعدد بار " الرحمن " بھی " اللہ " کی طرح ایک مستقل اسم کے طور پر استعمال ہوا ہے[1] ۔ بلکہ بعض جگہ تو گویا " اللہ " کے بدل اور مترادف کے طور پر آیا ہے[2] ۔ جب کہ " الرحیم " ہر جگہ بطور " صفت " کے ہی آیا ہے ۔

---

[1] لفظ " الرحمن " قرآن کریم میں (۵۷) جگہ آیا ہے جس میں سے کم از کم (۴۵) مقامات ایسے ہیں جہاں وہ " اللہ " کی جگہ بطور اسم استعمال ہوا ہے ۔ سورۂ مریم ، طٰہٰ ، الانبیاء ، یٰسٓ ، الزخرف اور الملک میں اس قسم کے استعمال کی زیادہ مثالیں ملتی ہیں ۔

[2] (حاشیہ اگلے صفحہ پر)

۶ ۔ " الرحیم " قرآن کریم میں ہر جگہ " رحمت " سے متعلق ہو کر آیا ہے ـــــ [اور یہ لفظ (رحیم) قرآن کریم میں بصیغہ نکرہ یا معرفہ مجموعی طور پر (۹۰) جگہ آیا ہے] ـــــــ جبکہ " الرحمن " عذاب، حکومت، ہیبت اور اقتدار کے ذکر کے ساتھ مربوط ہو کر بھی وارد ہوا ہے[1] ۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ لفظ " رحیم " کی جمع رحماء مستعمل ہے جبکہ لفظ رحمٰن کی جمع نہیں آتی ۔

۷ ۔ بعض اہلِ علم کے نزدیک " رحمن " دراصل غیر عربی (عبرانی) لفظ ہے جو اپنی اصل زبان میں " اللہ " ہی کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا ۔ پھر عربی میں بھی " اللہ " کے ہم معنی ـــ یا " اللہ " ہی کا دوسرا نام سمجھا جانے اور استعمال کیا جانے لگا ـــ اور اس مقصد کے لئے یہ ہمیشہ معرف باللام آتا ہے ۔ اکثر اہلِ علم نے اس کی اصل عبرانی یا سُریانی بتائی ہے اور یہ کہ یہ اصل میں " رخمان " یا " رھمان " تھا[2] ۔ قرآن کریم میں حضرت ہارون علیہ السلام کے قول (طٰہٰ : ۹۰) سے بھی کم از کم بالواسطہ طور پر اس نظریہ کی تائید کا کچھ پہلو نکلتا ہے ۔

۸ ۔ مندرجہ بالا ۵ ، ۶ ، ۷ کی روشنی میں " رحمن " کا مادہ " رح م " سے مشتق ہونا بھی محلِ نظر ٹھیرتا ہے ۔ یہ الگ بات ہے کہ بہت سے عجمی الفاظ عربی اوزان پر پورے اترتے نظر آتے ہیں تاہم یہ ان کے عربی الاصل ہونے کی پکّی دلیل نہیں ہوتی ۔

۹ ۔ یہ بھی ممکن ہے کہ لفظ " رحمن " اپنے اصل معنوں میں بھی " رحمت والا " ہی کے معنی میں مستعمل ہوتا ہو ۔ پھر عربی میں بھی ان ہی معنی کے ساتھ آیا ہو ۔ عربی کی طرح عبرانی، سریانی

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) مثلاً البقرہ : ۱۱۶ ، مریم : ۸۷ و ۸۸ اور البقرہ : ۸۰ اور الاسراء : ۱۱۰ تو ان معنوں کے لئے بالکل واضح ہے ۔

[1] مثلاً مریم : ۴۵ ، الفرقان : ۲۶ اور النبأ : ۳۸ میں

[2] ابن کثیر (طبع دارالمعارف) ج ۱ ص ۳۷ ، مزید حوالوں کے لئے دیکھئے قاموس قرآن (قرشی) ج ۲ ص ۵۷ ۔ نیز دیکھئے " مدّ القاموس " تحت مادہ " رحم " جہاں اس کی اصل بحروف عبرانی لکھی ہے ـــ غرائب اللغۃ العربیہ (ص ۱۸۲) میں اس کی اصل آرامی بتائی گئی ہے ۔ اور اس کی اصل شکل " رحمونو " بحروف سریانی لکھی گئی ہے ۔

آرامی وغیرہ بھی سامی زبانیں ہیں اور ان سب میں الفاظ کی بنیاد عموماً ایک تین حرفی مادہ ہوتا ہے (جو یہاں "رحم" ہے) اور ان زبانوں کے بعض مادوں میں لفظی اور معنوی مماثلت اور مشارکت عام پائی جاتی ہے۔ اسی طرح آریائی زبانوں کے بہت سے ہم معنی کلمات کا تلفظ بھی مماثل یعنی ملتا جلتا پایا جاتا ہے مثلاً سنسکرت بھراتر، فارسی برادر اور انگریزی کے BROTHER وغیرہ میں۔

۱۰۔ بہرحال اگرچہ لفظ عجمی بھی تھا تب بھی نزول اسلام کے وقت یہ عربی زبان میں اپنے مذکورہ معنی کے ساتھ مستعمل تھا۔ قرآن کریم (الفرقان: ۶۰) اور واقعات سیرت (مثلاً صلحنامہ حدیبیہ کی تحریر کے وقت) میں جہاں کفار مکہ کے "الرحمن" سے شناسائی کے انکار کرنے کا ذکر آتا ہے وہ صرف اظہار تکبر اور "ناک چڑھانے" والی بات تھی ورنہ "الرحمن" کا استعمال جاہلی شاعری میں بھی پایا جاتا ہے۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ وہ لوگ ذات باری تعالےٰ کے لئے "اللہ" کا لفظ زیادہ استعمال کرتے تھے۔ مزید تفصیل کے لئے تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۳۷، تفسیر کشاف ج ۱ ص ۴۲ (مع حاشیہ) قاموس قرآن ج ۲ ص ۷۶، وغیرہ کو دیکھئے۔

۱:۱:۲ الاعراب

"بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ"

کے شروع کی "باء" [بِ] حرف الجر ہے اور ["اسم"] مجرور بالجر ہے جس میں علامت جر "م" کا کسرہ (ـِـ) ہے۔ اور یہ آگے مضاف ہونے کی وجہ سے خفیف ہے (نہ اس پر لام تعریف آیا ہے نہ آخر پر تنوین)۔

["اللّٰهِ"] مجرور بالاضافۃ ہے (اسم کا مضاف الیہ ہوکر) اور اس میں علامت جر آخری "ھاء" کی زیر (کسرہ) ہے۔

["الرحمٰن"] بلحاظ اعراب "اللہ" کے تابع ہے[1] اور پھر اس کی بھی دو صورتیں ہوسکتی ہیں:۔

---

[1] حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں

اس (صفتی) صفت غالب ہونے کی وجہ سے ... کا بدل بھی ہو سکتا ہے۔
(حاشیہ) یہاں ... لفظ "بدل" نحوی اصطلاح ہے۔
(۲) اللہ کی نعت (صفت) بھی ہو سکتا ہے — دونوں صورتوں میں وہ لفظ "اللّٰہِ" کی وجہ سے مجرور ہے اور علامت جر "نِ" کا کسرہ (ـِـ) ہے۔ لفظ "رحمن" ویسے تو غیر منصرف ہے مگر معرف باللام ہونے کی وجہ سے بحالتِ جر اس کے آخر پر کسرہ (ـِـ) آئی ہے۔

[الرحیم] یقیناً صفت ہے۔ تاہم اگر "الرحمن" کو بدل مانا جائے تو پھر یہ "الرحمن" کی صفت ہی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ بدل کے بعد مُبدل منہ (جو یہاں "اللہ" ہے) کی صفت نہیں آیا کرتی۔ اور اگر "الرحمن" کو (اللہ کی) صفت مانا جائے تو پھر "الرحیم" بھی اسی (اللہ) کی دوسری صفت ہو سکتا ہے۔ اور اس کے مجرور ہونے کی یہ دونوں وجہیں ہو سکتی ہیں۔ علامت جر اس میں آخری میم (م) کا کسرہ (ـِـ) ہے۔

لفظوں کے الگ الگ معنی اور مندرجہ بالا ترکیب (نحوی) کے مطابق پورے "بسم اللہ" کا لفظی ترجمہ کچھ یوں ہوگا۔

۱۔ الرحمن کو بدل مانیں تو ترجمہ "اللہ یعنی بڑے مہربان "رحمن" کے نام کے ساتھ" ہوگا۔

۲۔ اور اگر "الرحمن الرحیم" دونوں کو صفت (نعت) مانیں تو اردو ترجمہ "رحیم رحمٰن یعنی دائم الرحمۃ اور کثیر الرحمۃ اللہ کے نام کے ساتھ" ہوگا۔

——— اس لئے کہ اردو میں عموماً صفت اپنے موصوف سے پہلے آتی ہے۔ تاہم اردو کے محاورے کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کا ترجمہ "اللہ کے نام کے ساتھ جو بے حد مہربان بار بار رحم کرنے والا ہے" سے کیا جاتا ہے — یہاں "جو" کسی اسم موصول کا ترجمہ نہیں بلکہ اردو میں صفت موصوف کی ترکیب کا

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) لفظ تابع یہاں نحوی اصطلاح کے طور پر آیا ہے۔ توابع اربعہ (نعت، عطف، توکید اور بدل) اور ان کے احکام نحو کا معروف موضوع ہے۔

ایک انداز ہے۔

اردو ترجمہ اور عربی تراکیب (نحوی) سے ظاہر ہے کہ پوری "بسم اللہ" ایک مکمل جملہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو (سارا بھی) ایک مرکب جاری (یعنی جار ومجرور) ہی رہ جاتا ہے۔ مکمل جملہ (مرکب تام یا مفید) بنانے کے لیے اس کے شروع میں کسی مبتداء یا فعل کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ مثلاً

۱۔ یا تو اس کے شروع میں لفظ "ابتدائی" مقدر (UNDERSTOOD) مانیں تو یہ جملہ اسمیہ بن کر ذہن میں آئے گا اور اس کا ترجمہ کچھ یوں سمجھا جائے گا "میری ابتداء یا میرا آغاز یا میرا شروع اللہ کے نام سے ہے جو .... الخ"

۲۔ یا پھر کوئی فعل مثلاً "اَبْتَدِئُ" یا اِبْتَدَأْتُ" مقدر (UNDERSTOOD) سمجھیں تو جملہ فعلیہ بن کر ذہن میں آئے گا اور اس کا ترجمہ کچھ یوں بنے گا — "میں ابتداء کرتا ہوں یا شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو ...... الخ" —— اور "بسم اللہ" کے اردو تراجم میں کسی نہ کسی طرح لفظ "شروع" لانے کی وجہ یہی ہے۔

"بسم اللہ" کے شروع میں کوئی فعل نہ لانے کا ایک فائدہ یہ ہے کہ آپ "بسم اللہ الرحمن الرحیم" پڑھ کر جو کام بھی کریں (اور مسلمان کو ہر کام بسم اللہ کے ساتھ شروع کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔) تو "بسم اللہ" کی "باء" (کے ساتھ) کی وجہ سے اس فعل (یعنی کام) کے مطابق معنی خود بخود سمجھے جائیں گے۔ مثلاً آکُلُ (میں کھاتا ہوں)، اَشْرَبُ (میں پیتا ہوں)، اَکْتُبُ (میں لکھتا ہوں)، اَرْکَبُ (میں سوار ہوتا ہوں) اَقْرَأُ (میں پڑھتا ہوں) یا اَذْبَحُ (میں ذبح کرتا ہوں) (وغیرہ) اللہ کے نام کے ساتھ جو ..... الی آخرہ۔

۱:۱:۳ الرسم

"بسم اللہ الرحمن الرحیم" کا یہ طریق املاء رسم عثمانی کے مطابق ہے۔ اور عربی زبان کے عام رسم املائی میں بھی اسے لکھنے کا یہی قرآنی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔

اس کے " رسم " کی حسب ذیل خصوصیات قابلِ توجہ ہیں :-

۱۔ اس میں " اسم " کا ابتدائی ھمزۃ الوصل (جو الف کی شکل میں ہوتا ہے) حذف کر کے " بائ (بِ) " کے ساتھ ملا کر لکھا جاتا ہے یعنی " بِسْمِ " جس میں " اسم " کا " الف " (جو ھمزۃ الوصل ہے) خطاً اور لفظاً دونوں طرح محذوف ہے۔ نہ لکھا جاتا ہے نہ پڑھا جاتا ہے۔ " اسم " کا یہ " الف " اگرچہ ھمزۃ الوصل ہی ہے اور اگر لکھا بھی جاتا تب بھی یہاں (بوجہ وصل) پڑھا نہ جاتا۔ جیسا کہ قرآن کریم میں " بِاسْمِ رَبِّكَ " وغیرہ میں آیا ہے۔ تاہم اسے کتابت میں حذف صرف اس وقت کیا جاتا ہے جب یہ (یعنی لفظ اسم) اسمِ جلالت (اللہ) کی طرف مضاف ہو اور اس (اسم) سے پہلے " بائ " (بِ) آرہی ہو ___ یعنی صرف " بسمِ اللہ " کی صورت میں۔ قرآن کریم میں ہر سورت کی ابتدائی " بسم اللہ " کے علاوہ دو اور مقامات پر یہ اس ترکیب اور اس کتابت کے ساتھ آیا ہے [ھود : ۴۱ ، اور النحل : ۳۰] ___ اگر یہ لفظ (اسم) اللہ تعالیٰ کے کسی اور (صفاتی) نام کی طرف مضاف ہو تو " باسم " ہی لکھا جاتا ہے (اگرچہ الف بوجہ ھمزۃ الوصل ہونے کے پڑھا نہیں جاتا)۔ اس کی تین مثالیں تو قرآن کریم میں ہی آئی ہیں [الواقعۃ : ۷۴ ، ۹۶ اور الحاقۃ : ۵۲] [له]

اگر (بِ) کے علاوہ کوئی اور حرفِ جار آجائے تو " اسم " کا ھمزۃ الوصل کتابت میں حذف نہیں ہوگا۔ مثلاً کوئی کہے " لِاسْمِ اللّٰهِ حَلَاوَةٌ " (اللہ تعالیٰ کے نام میں ایک مٹھاس ہے) یا کوئی کہے " لَيْسَ اسْمٌ كَاسْمِ اللّٰهِ " (کوئی نام اللہ تعالیٰ کے نام کی مانند نہیں ہے) ___ بلکہ بعض اہلِ علم تو اس " رسم " کو اس حد تک " بسم اللہ " کی

له قرآن کریم میں لفظ " اسم " کل ۲۷ دفعہ آیا ہے۔ نو[۹] دفعہ تو " اسم اللہ " ، آٹھ[۸] بار " اسم ربک " ، ایک[۱] دفعہ " اسم ربہ " کی صورت میں ، پانچ[۵] مقامات پر " اسمہ " اور تین[۳] جگہ " بسم اللہ " اور ایک[۱] جگہ " بئس الاسم الفسوق " کی شکل میں۔ مزید وضاحت کے لئے دیکھئے المعجم المفہرس (فؤاد عبدالباقی) تحت مادہ " سمو "۔

خصوصیت بتاتے ہیں کہ اگر " بسم اللہ " کے بعد " الرحمن الرحیم " کی بجائے کوئی اور صفاتی نام لکھے جائیں تو بھی اسم کا ھمزہ حذف نہ ہوگا مثلاً " باسْمِ اللّٰہِ الملکِ القدوسِ " لکھنے میں ۔ خیال رہے (ب) کے علاوہ کسی دوسرے حرف الجرّ کے ساتھ لفظ اسم کے مرکب ہوکر آنے کی قرآن کریم میں کوئی مثال نہیں ہے ۔

رہی یہ بات کہ آخر اس املائی فرق کی وجہ کیا ہے ؟ یا یہ کہ " بسْم " میں " ب " کا نبرہ (دندانہ) اونچا کیوں لکھا جاتا ہے مثلاً " بِسْم " کیوں نہیں لکھا جاتا ؟ وغیرہ ۔ اس قسم کے سوالات کتب رسم میں اٹھا کر ان کے جواب بھی لکھے گئے ہیں ۔ ایسے بزرگوں پر اللہ کی رحمت ہو مگر ان کے ان " منطقیانہ " اور " فلسفیانہ " ارشادات سے اس فلسفی کی کہانی یاد آتی ہے ۔ جس نے دیوار پر اُپلے لگے دیکھے تو فلسفیانہ توجیہات میں کھوگیا ۔ سیدھی سی بات یہ ہے کہ مصاحفِ عثمانی میں یہ الفاظ و مرکبات اسی طرح لکھے گئے تھے ۔ ہم رسمِ عثمانی کی تقلید اور اس کے اتباع کے پابند ہیں ۔ اس پر تنقید یا اس کی توجیہ نہ جائز ہے نہ لازم ۔ اور نہ ہی ہر عقلی توجیہہ ہمیشہ درست ہوتی ہے[ل]۔

۲۔ اسمِ جلالت کی املاء " اللہ " ہے ۔ حالانکہ اس کا تلفظ " اللّاہ " یا " اَلْ آہ " ہے ۔ تاہم قرآن کریم میں ہمیشہ ۔ اور اس کے اتباع میں عام عربی املاء میں اسے ہمیشہ اسی طرح (اللہ) لکھا جاتا ہے ۔ یعنی " ا ل ل ھ " کے ساتھ ۔ خط یا اندازِ کتابت مختلف ہو سکتا ہے مگر بنیادی رسم اور املاء یہی رہے گا ۔ مثلاً لاہوری اردو نستعلیق میں اسے " اللہ " لکھتے ہیں ۔ اور یہ بالکل درست ہے اس میں اصل املاء محفوظ ہے ۔ اس اردو کتابت کے موجد حافظ محمد یوسف سدیدیؒ تھے ۔ فارسی،

ل مزید بحث کے لئے چاہیں تو دیکھئے نثر المرجان ج ۱ ص ۹۲ ، ۹۴ ۔ البیان (للانباری) ج ۱ ص ۱ اور القیسی کی " مشکل الاعراب " ج ۱ ص ۱۵ ۔ خصوصاً مقدم الذکر جس میں " بسم اللہ " کی کتابت کے بارے میں بعض ماثور روایات بھی مذکور ہیں ۔ جن میں سے بعض کی صحت بھی محلِ نظر ہے ۔

تزالی (جب یہ بحروف عربی لکھی جاتی تھی) اور پرانی اردو نستعلیق میں اسے " اللہ " کی صورت میں بھی لکھا جاتا (رہا) ہے جو بظاہر غلط معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اس میں دوسری " ل " کو بالکل نبرہ (دندانہ) کی شکل دے دی گئی ہے (یعنی بَ یا نَ یا یَ کی مانند) اور آخری " ھ " نستعلیق کے لحاظ سے تو " د " کا آخری پیوند معلوم ہوتا ہے۔ تاہم املاء کے بنیادی چار حروف (ال ل ہ) اس میں موجود ضرور ہیں چاہے ان کے لکھنے کا انداز علمی لحاظ سے معیوب سمجھا جائے۔ اس سلسلے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ بعض افریقی ممالک (مثلاً غانا) کے مصاحف میں یہ لفظ " اللہ " لکھا جاتا ہے۔ اس میں آخری ترچھا حصہ تو " ہ " ہی ہے جسے " ۸ " کی طرح لکھ دیا گیا ہے۔ البتہ درمیانی " لام " کو بَ ۔ نَ اور یَ وغیرہ کے نبرہ (دندانہ) کی طرح لکھا گیا ہے یعنی اردو کے قدیم نستعلیق خط کی مانند۔ چین میں یہ لفظ " اللہ " کی شکل میں لکھا جاتا ہے یعنی دونوں لام (کے سرے) آخری " ہ " سے ذرا نیچے رہ جاتے ہیں تاہم اصل املاء (ال ل ہ) محفوظ ہے۔

۳۔ [الرحمن] اس جگہ (بسم اللہ میں) بلکہ پورے قرآن کریم میں ہر جگہ (" م " کے بعد والے) الف کے حذف کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔ (اور یہ لفظ قرآن کریم میں ۔ بسم اللہ کے علاوہ ــــ ستاون (۵۷) دفعہ آیا ہے)۔ اور رسم عثمانی میں اس کا اسی طرح (بحذف الف) لکھا جانا بلا اختلاف ثابت ہے ــــ یعنی اسے " الرحمان " لکھنا سخت غلطی ہے۔ اور اسی قرآنی رسم الخط کے اتباع میں ــــ یہ لفظ عام عربی املاء میں بھی عموماً اسی طرح (بحذف الف) لکھا جاتا ہے۔ بلکہ جہاں بھی یہ اسم " اللہ " کے بدل یا اس کی صفت کے طور پر مستعمل ہو وہاں بھی اسے اسی رسم کے ساتھ لکھنے کا رواج ہے۔ مثلاً " عبدالرحمن " میں۔

۴۔ اور [الرحیم] کی یہ املاء تو خیر عربی کے عام املائی قواعد کے بھی مطابق ہی ہے۔

۴:۱:۱ الضبط

"بسم اللہ الرحمن الرحیم" میں چار کلمات کی ابتداء میں ھمزۃ الوصل آتا ہے۔ [اسم ، اللہ ، الرحمن اور الرحیم] "اسم" کے ھمزہ کے کتابت میں محذوف ہونے کی بات ابھی بحث الرسم میں ہوچکی ہے۔ باقی تین کلمات کا ھمزۃ الوصل کتابت میں موجود رہتا ہے اگرچہ بوجہ وصل پڑھا نہیں جاتا۔ ھمزۃ کی اس "خاموشی" کو عرب اور افریقی ممالک کے مصاحف میں ھمزہ (بصورت الف) پر وصل (صلہ) کی علامت ڈال کر ظاہر کیا جاتا ہے اور یہ علامت عرب ممالک میں تو "ص" کا باریک سرا (صـ) ہوتا ہے (ٱ) ۔ افریقی ممالک میں یہ اکثر سیاہ گول نقطہ کی شکل میں لکھتے ہیں۔ البتہ بعض ممالک میں یہ نقطہ باریک اور بعض میں زیادہ نمایاں لکھا جاتا ہے (أ ، أ)۔ بعض افریقی ممالک میں ھمزۃ الوصل کے لئے الف کے اوپر بڑا سا سبز رنگ کا گول نقطہ ڈالا جاتا ہے ـــ اس کے مقابلے پر ھمزۃ القطع کے لئے زرد رنگ کا بڑا سا گول نقطہ ڈالتے ہیں ـــ تاہم یہ اہتمام صرف رنگ دار طباعت میں کیا جاتا ہے ـــ یا قلمی مصاحف کے دور میں مختلف رنگ کی سیاہی استعمال کی جاتی تھی ـــ یعنی تمام حروف کالی سیاہی سے، تمام حرکات سرخ روشنائی سے، ھمزۃ الوصل سبز گول نقطے سے اور ھمزۃ القطع زرد گول نقطے سے ظاہر کئے جاتے تھے ـــ آج کل طباعت میں سب کچھ کالی سیاہی میں چھپنے کے باعث ھمزۃ الوصل کے لئے الف پر گول نقطہ اور ھمزۃ القطع کے لئے "ء" یا "E" کی علامت استعمال ہوتی ہے (أ ، ا ، آ ، أ) ۔ برصغیر، ایران، ترکی اور بیشتر مشرقی ممالک میں یہ طریقہ رائج ہے کہ جو بھی حرف "خاموش" ہے یعنی پڑھنے میں نہیں آتا اس کو ہر طرح کی علامتِ ضبط سے عاری یعنی خالی رکھا جاتا ہے۔ اور یہ قاعدہ صرف ھمزۃ الوصل میں ہی نہیں بلکہ حرفِ شمسی سے ماقبل لام اور واو جمع کے بعد آنے والے الف پر اور وصلِ حروف کی بعض دوسری صورتوں میں بھی ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ جس کی مثالیں آگے چل کر ہمارے سامنے آئیں گی۔

اسم جلالت "اللہ" میں درمیانی لام اِشباع سے (کھینچ کر) پڑھا جاتا ہے یعنی "اللاہ" کی طرح۔ تاہم یہ عجیب بات ہے کہ تمام عرب اور افریقی ممالک کے مصاحف

میں اسے " اللّٰہ " لکھتے ہیں۔ حالانکہ اس ضبط کے ساتھ تو اسے " اَلّٰہ " ہی پڑھا جا سکتا ہے۔ معلوم نہیں وہ لوگ اسے کس طرح ٹھیک تلفظ سے پڑھتے ہیں۔ غالباً اپنی عربی دانی کی بنا پر یا اس لئے کہ " اللہ " کا یہ (باشباع) تلفظ ان کے ہاں جانا پہچانا ہے۔ تاہم ناخواندہ — یعنی صرف ناظرہ خوان غیر عربی دان تو اس ضبط کے ساتھ اسے کبھی درست نہیں پڑھ سکتا۔

ایران، ترکی اور برصغیر میں اس کا ضبط یہ اختیار کیا گیا ہے " اللّٰہ " یعنی علامت تشدید (ــّ) کے اوپر کھڑی زبر (ــٰ) لکھی جاتی ہے۔ جو لام کے اشباع (مدطبیعی) کی علامت ہے — چین میں [اور شاید وسط ایشیا کی ان مسلمان ریاستوں میں بھی جو اب روس کے قبضے میں ہیں، یہی طریقہ رائج رہا ہو] اس کو اللہ ضبط کیا جاتا ہے " اللہ " — یعنی پورے لفظ پر ایک لمبی ترچھی مگر باریک " مد " ڈال دی جاتی ہے اور یہ بھی لام کے اشباع پر دلالت کرتی ہے — مگر عرب اور افریقی ممالک کے مصاحف میں قاری کو اس اشباع سے آگاہ کرنے والی کوئی علامت ضبط نہیں لگائی جاتی۔

کتب علم الضبط میں عرب اور افریقی ممالک کے اس طریق ضبط کی ایک فلسفیانہ و منطقی توجیہ یہ مذکور ہوئی ہے کہ یہ اسے (اسم جلالت کو) لفظ " اللات " سے ممتاز کرنے کے لئے کیا جاتا ہے جو ایک بت کا نام تھا۔ در قرآن کریم النجم : ۱۹ میں اس کا ذکر آیا ہے۔ جس کا ضبط ان کے ہاں یوں ہے " اَللّٰت " یعنی دوسرے لام پر (پہلا تو خاموش ہی ہے) — تشدید معہ فتحہ " ــَّ " ڈال کر اس " ل " اور " ت " کے درمیان چھوٹا سا الف (کھڑی زبر ــٰ) ڈالتے ہیں۔ جس سے " لا " کی آواز پیدا ہو گی — حالانکہ ضبط کے اس فرق سے الٹا " اللات " کے لام کے اِشباع کا تو بندوبست کر دیا گیا ہے مگر " اللہ " کی لام کا اشباع اشتباہ میں ڈال دیا گیا ہے — اس مسئلے کا درست حل تو علم التجوید میں ہے کہ اسم جلالت (اللّٰہ) ماقبل مفتوح یا مضموم ہو تو تفخیم سے (پُر کر کے) پڑھا جائے گا مگر " اللات " ماقبل مضموم ہوتے ہوئے بھی مفخّم نہیں پڑھا جائے گا۔

تاہم ضبط کے نقطۂ نظر سے اسم جلالت میں لام کے اِشباع کے لئے کوئی علامت ضبط نہ ڈالنا عرب اور افریقی ممالک کے ضبط کا ایک عیب ہے۔ جبکہ مشرقی (عجمی) ممالک کے

مسلمانوں نے محسوس کیا اور اس کے لئے ایک علامت (ںٰ) مقرر کی ۔ بلکہ اب تو ایک پاکستانی عالم (مولوی ظفر اقبال مرحوم) نے " اللہ " کی تفخیم کے لئے بھی ایک خاص علامت (ںٰ) وضع کی ہے ۔ جسے تجویدی قرآن مطبوعہ پکیجز لمیٹڈ' لاہور میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

دراصل عرب اور افریقی ممالک میں الف مدہ محذوفہ میں ماقبل کی فتحہ (ـَ) لکھے بغیر مدّ کا تصور ہی نہیں ہے ۔ اس لئے وہ اسم جلالت کے لام پر شدّ اور فتحہ (ـّـَ) ڈالتے ہیں۔ اب اگر اس کے ساتھ مدّ کی خاطر الف محذوفہ کا اثبات (بصورت چھوٹا الف یا کھڑی زبر) بھی کیا جائے تو پھر اسے " اللَّـٰه " لکھنا پڑے گا جو ان کے ضبط کے مطابق لکھے ہوئے " اللَّـٰت " سے مشابہ ہی ہو جائے گا۔ اس لئے ان تمام ملکوں میں یہ لفظ یعنی اسم جلالت غلط علامت ضبط کے ساتھ لکھا جاتا ہے اور اس کا درست پڑھنا صرف شفوی (زبانی) تعلیم پر منحصر ہے ۔

برصغیر وغیرہ میں صرف کھڑی زبر (ـٰ) کو الف ماقبل مفتوح (ـَـا) کے برابر سمجھا جاتا ہے اور یوں اسم جلالت پر ڈالی گئی علامت (ںٰ) کو (ـّـَا) کے برابر سمجھ کر پڑھا جاتا ہے ۔ اور یہ بات عرب اور افریقی ملکوں کے اہلِ علم تک سمجھ نہیں پائے ۔

اسم جلالت کے اس ذرا مفصّل تقابلِ ضبط سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ عرب اور افریقی ممالک کا ضبط غیر عربی دان ناظرہ خوانوں کے لئے موجب التباس ہے اور" اللہ" جیسے اہم کلمہ کے [جسے نہ صرف لام کے اشباع بلکہ اس کی تفخیم کے ساتھ پڑھنا ضروری ہے ۔ جب کہ اس کا ماقبل مضموم یا مفتوح ہو] غلط پڑھنے کا باعث بن سکتا ہے ۔ اور اس سے سعودی حکومت کے اس حکم کی نامعقولیت واضح ہو جاتی ہے جس کی رو سے ان تمام حجّاج کو حرمین شریفین میں رکھے ہوئے حکومت کے اپنے مطبوعہ مصحف سے تلاوت پر مجبور کیا جاتا ہے ۔ جو اس مصحف کے طریق ضبط سے قطعاً ناآشنا ہونے کے باعث قرآن کریم کی صحیح تلاوت سے بھی محروم رہتے ہیں ۔

[الرحمٰن] کی " میم " کے اشباع کے لئے بھی (اور تمام محذوف الالف الفاظ ـــ اسماء ہوں یا افعال یا حروف کے لئے بھی) ـــ مختلف علاماتِ ضبط کا رواج ہے ۔ عرب اور افریقی ممالک میں اس کے لئے میم پر فتحہ (ـَ) ڈال کر ساتھ چھوٹا

سا الف (جو محذوف تھا) لکھتے ہیں ("سمٰ") اس لئے کہ اس کا اصل تلفظ "الرحمان" تھا مگر رسم عثمانی میں اس کا الف محذوف تھا۔ اس لئے میم پر فتحہ (مَ) کے بعد اس محذوف الف کی یادگار چھوٹا سا الف یا کھڑی لکیر ڈالی جاتی ہے تاکہ اسے "ما" پڑھا جاسکے۔ بعض ممالک ــ مثلاً لیبیا ــ میں یہ محذوف الف خاصا "موٹا" اور نمایاں لکھا جاتا ہے (سمٰا) اور بعض عرب اور افریقی ملکوں (مثلاً تونس) میں اسے عام کتابت سے باریک مگر زیادہ لمبا کرکے لکھا جاتا ہے ("سمٰا")۔ تاہم عام طور پر اسے عام کتابت کے الف (ا) سے قریباً نصف یا تہائی کے برابر ہی لکھتے ہیں۔

برصغیر پاک و ہند اور ترکی و ایران میں کھڑی زبر (ـٰ) کو الف ماقبل مفتوح (ـَا) کے برابر سمجھا جاتا ہے یعنی (سمٰ) کو "مَا" ہی پڑھا جاتا ہے لہٰذا اسی طرح صرف کھڑی زبر لکھنا کافی سمجھا جاتا ہے ــ یعنی "الرحمٰن" ہی لکھتے ہیں ــ چین میں اسم جلالت کی طرح اس لفظ پر بھی لمبی ترچھی مد لکھتے ہیں یعنی "الرَّحمٰن" لکھتے ہیں ــ اور جیسا کہ پہلے بحث استعاذہ میں لفظ "مِن" اور "شیطن" کے آخری "نون" کے سلسلے میں بیان ہوا ــ یہاں بھی بیشتر افریقی ممالک میں آخری نون پر نقطہ نہیں ڈالتے یعنی اسے "الرَّحمٰں" ہی لکھتے ہیں ــ اور بعض جگہ آخری نون پر نقطہ ڈالتے بھی ہیں تو "ن" کے "پیٹ" میں نہیں بلکہ دائیں طرف کے (پہلے) سرے پر لکھتے ہیں ــ (یعنی الرحمں)۔

[الرَّحِیْم] میں "حاء" (ح) کے بعد والی "یاء" (ی) پر برصغیر پاک و ہند کے سوا دنیا کے کسی اسلامی ملک میں بھی علامت سکون (ـْ) نہیں ڈالی جاتی ــ سب جگہ اسے (الرَّحِیم) ہی لکھتے ہیں ــ بلکہ ان ملکوں میں "یا" ماقبل مکسور (ـِی) پر کہیں بھی سکون کی علامت نہیں لکھی جاتی۔ صرف "یا" ماقبل مفتوح (ـَی) پر ہی یہ علامت ڈالتے ہیں۔ صرفی نحوی منطق کے اعتبار سے یہ قاعدہ درست ہے۔ تاہم غیر عربی دان ناظرہ خوان کے لئے یہ ضبط بھی ناقص اور باعث التباس ہوسکتا ہے۔ اس لئے برصغیر میں اس "یا" پر علامت سکون ڈال کر (الرَّحِیْم) لکھتے ہیں۔

ایران اور ترکی میں (عرب ملکوں کی طرح) اس "یاء" پر علامتِ سکون تو نہیں ڈالتے مگر "حاء" کے نیچے عام کسرہ (ـِـ) کی بجائے علامتِ اِشباع والی کھڑی زیر (ـٖـ) ڈال کر (الرَّحِیم) لکھتے ہیں۔

مندرجہ بالا بحث کی روشنی میں "بسم اللہ الرحمن الرحیم" کے ضبط کی مندرجہ ذیل صورتیں سامنے آتی ہیں:-

بِسْمِ - بِسْمِ - بِسْمِ - بِسْمِ

اللّٰہِ - اَللّٰہِ - اِللّٰہِ - اِللّٰہِ - اَللّٰہِ

الرَّحْمٰنِ - الرَّحْمٰنِ - اَلرَّحْمٰنِ - اَلرَّحْمٰنِ - اَلرَّحْمٰنِ -

اَلرَّحْمٰنِ - الرَّحْمٰنِ -

الرَّحِیْمِ - الرَّحِیْمِ - اَلرَّحِیْمِ - اَلرَّحِیْمِ - اَلرَّحِیْمِ -

اس ضمن میں ایک قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ حرف "میم" جو "بسم اللہ" ہی میں تین جگہ آیا ہے، کو کُتّابِ مصحف (خصوصاً افریقی ممالک میں) اس طرح لکھتے ہیں کہ اس کے سر کے کو اندر سے ہمیشہ خالی لکھتے ہیں۔ (م ، سم) اس کی وجہ ایک حدیثِ نبویؐ ہے کہ آنحضورؐ نے اپنے ایک کاتبِ وحی کو فرمایا تھا "لَا تُعَوِّرِ الْمِیْمَ" "کہ میم کو اس کی آنکھ مٹا کر نہ لکھو" یعنی "م - سم" کو "م یا سم" نہ لکھو۔ یہ ہدایت "بسم اللہ" کی کتابت کے بارے میں مروی ہے تاہم اس کو قرآن کریم کی کتابت میں ہر جگہ ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ البتہ برصغیر ترکی اور ایران میں اس کی ہر جگہ پابندی نہیں کیجاتی۔

(جاری ہے)